© rasailojaraid.com

فکرونظر .... اسلام آباد جلد: ۴۹ شمارہ: ۴

”انیسویں اور بیسویں صدی کے ہندوستانی مسلم جدیدیت پسند اور مسئلہ زن“

ثمینہ حسنین☆

ABSTRACT

Leaving aside the very early maternal societies humanity had not yet become aware of the concepts of personal ownership, rights and duties, and inequality, in every age, especially in the medieval age inequality between man and woman was an accepted fact. Regardless of the Quranic concept of the relations between man and woman, even in the medieval Muslim societies we do not see the condition of women any better.It was in the modern period that the issue of equality of man and woman, women's rights and freedom arose and developed. In the modern Muslim world this issue arose at the time when the West came with its imperialistic and philosophical influences. It was then that the orientalists and missionaries began ridicule the Muslims in many areas, and the matter of equality between man and woman was a key area. In India, especially in the north, Muslim modernists, the representatives of Aligarh school, made this issue a point of focus and discussion in their debates. This paper analyzes this discussion.

☆ اسسٹنٹ پروفیسر (شعبہ اسلامی تاریخ)، یونیورسٹی آف کراچی، کراچی

© rasailojaraid.com
© Dr Muhammad Hamidullah Library, IRI, IIU, Islamabad. http://iri.iiu.edu.pk/

© rasailojaraid.com

کیا ایک اسلامی ریاست میں خواتین کو یہ حیثیت حاصل ہے کہ وہ مردوں کی طرح پہلے درجے کی شہری سمجھی جائیں اور اسی طرح مکمل رکن اور صاحب ایمان شمار ہوں جیسے مرد ہوتے ہیں! برنارڈ لوئس کا کہنا یہ ہے کہ مرد و زن کی مساوات کا تصور دوسرے سماجی گروہوں، مذاہب، اقوام اور ریاستوں کی طرح، اسلام میں بھی نسبتاً جدید ہے جو مغرب سے آیا ہے۔(۱) قرون وسطٰی کی مغربی دنیا بھی، عالم اسلام کی طرح مساوی حقوق اور صنفی مساوات کے تصور سے ناواقف تھی۔ اس دور میں اور اس سے پہلے بھی (سوائے ابتدائی قبائلی عہد کے جب فرائض اور حقوق کے درمیان کوئی امتیاز نہیں تھا)(۲) جب مختلف گروہوں کو قانون اور اس پر عمل درآمد کے معاملے میں ادارے کی حیثیت حاصل ہوگئی تو یہ عدم مساوات، اس نظام کا حصہ قرار پائی۔ مسلمان معاشرے بھی اس سے مستثنٰی نہیں۔

اگر یہ تجزیہ درست ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کا ذکر ایسے مذہب کے طور پر کیوں کیا جاتا ہے جو مساوات کا قائل ہے؟ برنارڈ لوئس کے نزدیک اگر ہم ساتویں صدی عیسوی کے عرب میں ان تبدیلیوں پر ایک نگاہ ڈالیں جو اسلام کی آمد کے ساتھ ظہور پذیر ہوئیں اور پھر ان کا موازنہ، اس عہد کے ہندوستان سے کریں جو ذات پات کے نظام کی گرفت میں تھا یا پھر اس کا تقابل مسیحی یورپ سے کریں جو طبقات پر مشتمل تھا تو پھر اس عدم مساوات پر مبنی معاشروں میں اسلام ایک ایسے مذہب کے طور پر نمایاں ہوتا ہے جو انسانی مساوات کا علم بردار ہے۔(۳) اس امتیاز کے باوجو اس عہد کے مسلمان معاشرے میں بھی عورت کو جو مساوی حقوق میسر تھے، مواقع اور مرتبے کا اعتبار سے محدود تھے۔ ایک مکمل شہری کا درجہ ایک آزاد مرد ہی کو حاصل تھا۔ آقا اور غلام، مسلم اور غیر مسلم، مرد اور عورت میں سماجی سطح پر عدم مساوات تھی اور اسلامی شریعت میں بھی اسے برقرار رکھا گیا۔ ان تینوں کو ان کی افادیت کے سبب سے خاص مقام اور منصب حاصل تھا...... سماجی اعتبار سے پست تر حالت خاتون کی تھی۔ غیر مسلم، اسلام قبول کر کے اور غلام، آقا کی مرضی سے آزاد ہو کر کم تر سماجی حالت سے نکل سکتا تھا۔ تاہم عورت اس پر قادر نہیں تھی کہ وہ صنف تبدیل کر لیتی۔ مسلمان

۱- Lewis,Bernard, *The Jews of Islam, New Jersey,* 1985, p.3-4

۲- Engels,Frederick , *The Origin of the Family, Private Property and the State,* Moscow, 1991, pp.259 ff.

۳- Lewis, *Jews of Islam,* p.8

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معاشرے میں غیر مسلم مرد، عورت اور غلام سے بہتر مقام رکھتا تھا۔ کنیز کا معاملہ تو یہ تھا کہ اس میں غلامی اور نسوانیت دونوں جمع ہو گئی تھیں۔ (۴)

یہ صرف انیسویں صدی میں ممکن ہوا کہ اسلام کے چند معذرت خواہوں، خاص طور سے مصلحین نے جدید مغرب کے زیر اثر یہ دعویٰ کرنا شروع کیا کہ اسلام عورتوں کو مساوی حقوق دیتا ہے۔اس سے پہلے کہ ہم اس جدید ردِ عمل کا جائزہ لیں، جو مرد اور عورت کے مساوی حقوق کے سوال پر پیدا ہوا،ہم تاریخ میں پیچھے جاتے ہوئے فریڈرک اینگلز کے حوالے سے دیکھیں کہ کیسے اور کب عیسائی مغرب میں مساوی حقوق کا خیال پیدا ہوا، خاص طور پر مرد اور عورت کے درمیان، اور پھر مشرق میں، بطور خاص اسلام میں متعارف ہوا۔

مساوی حقوق کو سب سے پہلے، کم از کم زبانی طور پر، اس وقت تسلیم کیا گیا:

> جب بورژوائی طبقہ، جاگیرداری کے خلاف اپنی جنگ میں دو باتوں پر مجبور ہوا۔ ایک یہ کہ سرمائے کے پیداواری ارتقاء میں جاگیردارانہ اور نجی مراعات کو ختم کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ انسانی مساوات کے تصور کو قانون میں متعارف کرایا جائے، پہلے نجی قانون کے حوالے سے اور پھر تدریجاً ریاستی قانون کی سطح پر۔(۵)

انیسویں صدی کے مغرب میں نئے ابھرتے ہوئے سیاسی اور سماجی ڈھانچے میں، ''سماجی مسئلے' کے ساتھ،'عورت کا مسئلہ' بھی اٹھا، جس نے بنیادی طور پر تغیر پذیر معاشرے میں عورتوں کے کردار کے مسئلے پر توجہ دی۔ یہاں اس بحث میں جانے کی ضرورت نہیں کہ مساوی حقوق کا تصّور، خاص طور سے عورتوں کے لیے، مسلم مشرق میں کن ذرائع سے منتقل ہوا اور پھلا پھولا''(۶) تاہم اس سلسلے میں چند حقائق کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ مرد اور عورت کے مساوی حقوق کا خیال جدیدیت/مغربیت کی اس میراث کا حصّہ تھی

۴- ایضاً،ص ۸-۹

۵- Engels, *Ludwig Feuerbach and the End of Classical German Philosophy,* New York, 1941, p. 39

۶- Murad,Qasim,Hasan, ***The Question of Equal Rights*** ,read in a conference in Istanbul, unpublished, p.3

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو مسلم دنیا کو مغربی تسلط میں آنے کے بعد ملا۔[۷] دوسرے یہ کہ مغربی خیالات اور ادارے مشرق اور مسلم دنیا کو منتقل تو ہوئے لیکن ضروری مادّی اساسی ڈھانچے کے بغیر اور وہ بھی یکساں طور پر نہیں۔[۸] تیسرے یہ کہ جدید عیسائی مغرب کی طرح اسلامی مشرق کی جدیدیت میں عورتوں کے مساویانہ حقوق کے لیے آواز متوسط اور بالائی بورژوازی نے اٹھائی، مگر مغرب کے برعکس مشرق میں مردوں نے عورتوں کی تحریکِ آزادی کے آغاز کے لیے پہل بھی کی۔[۹] اس سلسلے میں کیرس واڈی (Charis Waddy) کا کہنا ہے کہ 'انیسویں صدی کے دوسرے نصف کے آغاز میں مسلم دنیا کے بہت سے حصّوں سے عورتوں کی اصلاح کے لیے آوازیں اٹھائی گئیں۔ اس وقت [عورتوں پر] جو پابندیاں تھیں ان کے ثبوت کے لئے باہر کے ناقدین کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر وہ مفکر جو اسلام کا احیاء چاہتا تھا، وہ عوامی رائے کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ عورتوں کو رواجی پردے اور ناخواندگی میں رکھنا اسلام کی اصل تعلیم نہیں ہے۔ عورتوں کے مرتبے اور وقار کے لئے آواز اٹھانے کی شدت سے ضرورت ہے اور [۱۹ویں] صدی کے آخر تک اس کا اظہار بھی ہونے لگا'۔[۱۰] یہ بات کہنے والوں میں مصر میں محمد عبدہ [م:۱۹۰۵]، قاسم امین [م:۱۹۰۸]، ترکی میں ضیاء گوکلپ [م:۱۹۲۴]، ہندوستان میں محسن الملک [م:۱۹۰۷]، خواجہ الطاف حسین حالی [م:۱۹۱۴]، شبلی نعمانی [م:۱۹۱۴]، ممتازعلی [م:۱۹۳۵]، راشدالخیری [م:۱۹۳۶]، شیخ عبداللہ [م:۱۹۶۵]، امتیازعلی [م:۱۹۷۰] شامل تھے۔ چوتھے یہ کہ مسلم مشرق میں عورتوں کی تحریکِ آزادی کو صرف مذہبی مسئلے کے طور پر دیکھا گیا، کیونکہ قومی تحریکِ آزادی کا آغاز کم از کم عرب مشرق میں مذہبی تحریک کے طور پر ہوا تھا اور مغرب کے خلاف جنگِ آزادی کو اکثر جہاد کے طور پر دیکھا گیا تھا۔ عرب قوم پرستوں نے اسلام کی بالادستی کے نام پر عورتوں کی آزادی کی حمایت کی[۱۱]۔ اس حمایت کی مثالیں ہمیں تاریخ میں ملتی ہیں جیسا کہ عرب دنیا اور دیگر علاقوں کی عورتوں کے اگر آزادی کی آواز اٹھائی تو محض مغرب کی نقالی میں نہیں۔ ان کی اکثریت

۷- Daniel Pipes, *In the Path of God: Islam and Political Power,* New York,1983, P.105 ff.

۸- Murad, p.4

۹- Marnissi,Fatima, *Beyond the Veil: Male-Female Dynamics in Muslim Society,* London, 1985, pp. 8

۱۰- Waddy, Charis, *Women in Muslim History,* London, 1980, pp.139

۱۱- Mernissi, *Beyond the Veil,* p. 8

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جس انتہائی بات کی خواہاں ہے، وہ ایسی آزادی کا کھوج ہے جو اپنی بنیادوں کو خطرے میں ڈالے اور اپنی شناخت کو کھوئے بغیر میسر آئے۔

گویا مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں نے اپنے حقوق کے لیے مغرب سے مختلف طور پر خود بھی کوششیں کیں جو ہمیں دنیائے اسلام کے مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ بعید میں دکھائی دیتی ہیں۔اس طرح انیسویں صدی کے نصف آخر سے شروع ہونے والی خواتین کی تحریکوں میں خواتین حصّہ لے رہی تھیں۔ہندوستان کی خواتین کا ان سرگرمیوں میں تندہی کے ساتھ حصّہ اور ان کی کوششیں انیسویں صدی کے آخر میں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔(۱۲) اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ لیڈی ڈفرن [م:۱۹۳۶]، جب ہندوستان سے واپس جانے لگیں تو ان کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد ہوئی جس میں شریک آٹھ سو خواتین نے ان کی واپسی پر اظہار افسوس کیا۔ لیڈی ڈفرن مروجہ پردے، مرد و زن کے عدم اختلاط اور صنفی برتری کے تصور کی ناقد تھیں۔(۱۳)

مسلم ہندوستانی تحریکِ نسواں کے بارے میں یہ بات اہم ہے کہ، کسی عرب اور مغربی تحریکِ نسواں کے برعکس، یہ تحریک کم از کم اپنے ابتدائی دور میں نہ صرف سیاسی سرگرمی اور جدو جہدِ آزادی سے، بلکہ کسی سوشلسٹ بنیاد سے بھی متأثر نہیں لگتی۔(۱۴) مغرب میں اگر ہم ان تحریکوں کو دیکھیں تو ان پر سوشلسٹ اثرات کافی نمایاں رہے۔ یہ بات دلچسپ اور معلومات میں اضافہ کرنے والی ہے کہ سوشلسٹوں نے سب سے پہلے وہ سیاسی نظریہ دیا جس میں عورتوں کے حقوق بھی شامل تھے اور پھر ایسی سیاسی جماعتیں بنائیں جنھوں نے پہلی مرتبہ عورتوں کے حقوق کو اپنے پروگرام میں داخل کیااور اپنے اجلاسوں کے دروازے عورتوں کے لیے کھولے۔

۱۲- Waddy, *Women in Muslim History, p. 138*

۱۳- Lateef,Shahida, *Muslim Women in India* Political and Private Realities *1890s-1980s,* Delhi,1990, p.78 [لیڈی ڈفرن ۱۸۸۴ء میں ہندوستان کے وائسرائے ارل آف ڈفرن کی بیوی تھیں۔انھوں نے ایک کامیاب برطانوی 'diplomatic wife' کے کردار کی وجہ سے شہرت پائی اور برطانوی ہند میں عورتوں کی جسمانی صحت کو بہتر بنانے کے حوالے سے کام کیا۔ انھوں نے عورتوں کی طبّی مدد کے لیے جو ایسوی ایشن قائم کی اس کا نام *National Association for Supplying Female Medical Aid to the Women in India* تھا۔]

۱۴- Murad, p.4

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۸۹۱ء میں دوسری بین الاقوامی انجمن نے، جو بین الاقوامی سوشلسٹ تحریک کی رہنمائی کرتی تھی، ممبر جماعتوں پرعورتوں کی مساوات کی حمایت کو لازمی قرار دیا۔ بہت سے یورپی ممالک میں عورتوں نے اس مقصد کو اپنا لیا۔ سوشلسٹ خواتین نے دوسری بین الاقوامی انجمن میں اپنی شاخ قائم کی، جرمنی میں اس کا مرکز بنایا، اپنی سرگرمیوں کوہم آہنگ کرنے کے لیے ۱۹۰۷ء اور ۱۹۱۰ء میں کانفرنسیں منعقد کیں اور بطور علامت بین الاقوامی خواتین کا ایک دن مقرر کیا جو خواتین کی سیاسی اصلاح کا مظہر تھا۔ خواتین اور مزدوروں کا یہ نیا اتحاد ایک فطری طور پر طبقاتی نظام کے موروثی تصّورات کو رد کر کے سیاسی میدان میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ پرانی سماجی اقدار زندہ رہیں اور نئے تصّورات کی کامیابی میں رکاوٹ پیدا کرتی رہیں۔[(۱۵)] تاہم یہ خوش آئند بات ہے کہ یہ مخالفت کبھی بھی مرد اور عورت کی کسی دشمنی کی بنیاد پر نہیں ہوئی، اور نہ ہی یہ جدوجہد ایک جنس سے دوسری جنس سے مخالفت کی تھی بلکہ یہ (مردوں کی) روشن خیالی اور (عورتوں کی) قدامت پرستی کے لیے، (مردوں کی) ترقی اور (عورتوں کے) ردِعمل کی بناء پر تھی۔ مغربی ممالک میں تحریکِ نسواں میں دو باہم متضاد رجحانات تھے۔ عورتوں کی ''خود مختاری'' (وومنز لبریشن) کو عورتوں کی ''آزادی'' کے مقابلے میں ایک معاندانہ رویے سے جوڑا گیا، جبکہ ''آزادی'' کا مقصد عورتوں پر عائد پابندی کو بتدریج ختم کرنا اور انھیں اظہار کے نئے یا تازہ مواقع فراہم کرنا تھا۔[(۱۶)]

عورتوں کے حقوق اور حیثیت کے سوال پر اسلام اور مغرب کے درمیان سب سے بڑا تنازعہ ذاتی تعلقات، یا سماجی اداروں یا اخلاقیات (بشمول نکاح، طلاق، وراثت) کے میدان میں ہوا۔[(۱۷)] شاہدہ لطیف کا کہنا ہے کہ دیگر معاشرتی طبقات کی طرح مسلمانوں نے بنگال میں سنٹرل محمڈن ایسوسی ایشن، بمبئی میں انجمنِ اسلام، لاہور میں حمایتِ اسلام، اور یوپی میں سرسیداحمدخان اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی سرگرمیوں کے ذریعے عورتوں کی حیثیت کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ ان کی کوششوں کا محور تعلیم تھا جس میں عورتوں کے حقوق شامل نہیں تھے کیونکہ مسلم خواتین کو پہلے ہی شرعی یا قانونی حقوق حاصل تھے جو کہ دیگر ہندوستانی عورتوں کو حاصل نہیں تھے۔ چونکہ بیسویں صدی کے آغاز تک ان اداروں نے عورتوں کی تعلیم کے لیے خاطر خواہ عملی اقدامات نہیں کئے تھے اس لیے حالی اور مولوی نذیر احمد کی تحریروں نے اس حقیقت کو اجاگر

۱۵- *Murad,* p.3

۱۶- Waddy, *Women in Muslim History,* p.139.140

۱۷- Gibb, H.A.R., *Modern Trends in Islam,* New York, 1978, p. 89

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا کہ مسلم خواتین کے پاس تعلیم کی کمی اور (مروجہ) پردے کی وجہ سے عملی طور پر اپنے حقوق کا اختیار نہیں ہے۔[۱۸] یہ صرف حالی اور نذیر احمد ہی نہیں تھے جنھوں نے عورتوں کی مساوات اور حقوق کے مسئلے کو محسوس کیا بلکہ نواب محسن الملک، چراغ علی [م:۱۸۹۵] اور شبلی نے بھی اس مسئلے کی طرف پوری توجہ کی اوران مسائل میں حقِ زوجیت اور حقِ وراثت کو بھی شامل کیا۔

زیرِ نظر مضمون میں،ہم ان جدیدیت پسند ہندوستانی مصلحین کی کوششوں پر روشنی ڈالیں گے جنھوں نے اسلام میں مرد اور عورت کے حقوق کے لیے کوششیں کیں۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں ہی جب ہندوستان کے چند مسلمانوں کو یورپ کا سفر کرنے کا موقع ملا تو انہوں نے سرمایہ داری کے دیگر ثمرات میں مغربی عورت کو حاصل حقوق اور شخصی آزادی کو دیکھااور اس سے متأثر ہوئے، جبکہ ان میں سے بعض نے اس شخصی آزادی پر نگاہِ تنقید بھی ڈالی اور اس کے مقابلے میں انھیں اپنے معاشرے میں عورتوں اور مردوں کا افتراق زیادہ درست معلوم ہوا۔

ابتدائی انیسویں صدی کے برطانوی ہندوستان میں جن لوگوں نے یورپ کا سفر کیا ان میں مرزا ابو طالب خان اور لطف اللہ خان کا ذکر خصوصیت سے ملتا ہے۔ ان دو شخصیات کے حالات کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور کے تمام مسلمانوں کا رویہ انگریزوں کی جانب صرف منفی ہی نہیں تھا بلکہ مثبت رویے رکھنے والوں کے شواہد بھی ملتے ہیں، اور یہ بھی کہ وہ یورپ کی ترقی اور انسان دوستی کے جدید تصور سے آگاہ ہوئے اور متأثر بھی۔ غالباً یورپ میں انسان دوستی کا یہ تصور ہی تھا جس نے عورتوں کی مساوات کے مسئلے کو اٹھایا ہوگا اور ان کے کچھ مساوی حقوق کا تعین کیا ہوگا، جس نے مشرق کے، خاص طور سے ہندوستانی مردوں کو اس مساوات کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع دیا۔ پہلے دو مسلم ہندوستانی جن کا ذکر اوپر ہوا چونکہ کسی تحریک یا جماعت سے وابستہ نہیں تھے اس لیے نہ تو وہ بہت شہرت پا سکے اور نہ ہی عملی طور پر اپنے معاشرے کی اصلاح کر سکے۔ بہرحال، ان کے تأثرات اور بیانات ہمیں اس بات کا پتہ ضرور دیتے ہیں کہ انھوں نے یورپ کا سفر کر کے اور اپنے ملک کے بدلتے ہوئے حالات کو دیکھتے ہوئے جدیدیت کو سمجھا اور سمجھایا۔ہم یہاں خاص طور سے عورتوں کے بارے میں ان کے جدید خیالات کو جانیں گے اور یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ انیسویں صدی کے بعد کے دور میں مسلم معاشرے میں ان کے خیالات کے کیا اثرات رہے۔

۱۸- Lateef, *Muslim Women in India,* p.81, Delhi,1990, *Private Realities 1890s-1980s,*

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جدید تصورات سے کسی قدر متأثر ہونے والے اور کسی قدران کے نقاد مرزا ابو طالب خان [م:۱۸۰۴]نے اپنے ۱۷۹۹ء سے ۱۸۰۳ء کے سفرِ ایشیاء، افریقہ، اور یورپ[۱۹] میں انگلستان میں کئی ہفتے گذارے اور اُس معاشرے کو نہ صرف براہِ راست دیکھا بلکہ غالباً پہلی مرتبہ اپنے ہم وطنوں کے لیے ایک رسالہ بعنوان ''ماثرِ طالبی فی بلادِ افرنج'' میں ان تأثرات کو قلمبند بھی کیا۔ وہاں انھوں نے عورتوں کی جس حیثیت اور مرتبے کا مشاہدہ کیا، وہ اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ انھوں نے اس قانون کی تعریف کی ہے جو عورتوں کو مردوں کے برابرقرار دیتا ہے اور انھیں اتنی ہی آزادی دیتا ہے جتنی کہ مردوں کو حاصل ہے۔[۲۰] وہ مغرب کی عورتوں کو حاصل ملازمت کی آزادی کو پسند کرتے ہیں کیونکہ یہ ملازمت انھیں بجائے غلط اور غیرشائستہ خواہشات میں پڑنے کے اچھی طرزِ زندگی کی طرف لے جاتی ہے۔[۲۱] گویا وہ سمجھتے ہیں کہ عورتوں کو چاہیے کہ اپنے فرصت کے لمحات کو بجائے فضول اور غیرصحت مندانہ کاموں میں ضائع کرنے کے ان لمحات کو کسی تعمیری کام میں صرَف کریں۔ وہ عورتوں کی اس صلاحیت کا ذکر بڑے ذوق وشوق سے کرتے ہیں کہ وہ کس طرح اپنی روز مرہ کی ذمہ داریوں کو پورا کر کے دکانوں [غالباً وہ دکانیں جہاں وہ ملازم ہوتی ہیں] کی دیکھ بھال کرتی ہیں اور اپنے پُر وقاراور پُرکشش طریقوں سے معاملات نمٹاتی ہیں۔ وہ اِن عورتوں کے اخلاق اور طرزِ عمل کی تعریف کرتے ہیں۔[۲۲] ابو طالب خان نے وہاں رائج یک زوجگی کے قانون کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا، اس کے فوائد کو خاص طور سے مستحسن قرار دیا۔[۲۳] ان کو اس بات کا احساس بھی ہوا کہ وہاں عورتوں کو تعلیم مکمل کرنے کی طرف مائل کیا جاتا ہے۔ وہ گانے، ناچنے، اور موسیقی کے ساز بجانے کی تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ لڑکے لڑکیوں دونوں کو یکساں طور پر اپنے والدین، بھائی، بہن اور رشتے داروں کی عزت اور احترام کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔[۲۴] مگر ابو طالب خان نے جن مشاہدات اور خیالات کا اظہار وہاں کے اداروں اور خاص طور سے عورتوں کے بارے میں کیا، اس کے لیے اپنے ملک واپس آ کر کسی سماجی

۱۹- مجیب اشرف، *Muslim Attitudes Towards British Rule And Western Culture in India*, Delhi, 1982, p. 210

۲۰- عزیز احمد، **برصغیر میں اسلامی جدیدیت**، مترجم: جمیل جالبی، ص۲۸

۲۱- مجیب اشرف، *Muslim Attitudes*، ص ۲۱۰

۲۲- ایضاً، ص ۲۱۰

۲۳- عزیز احمد، **برصغیر میں اسلامی جدیدیت**، ص ۲۸

۲۴- مجیب اشرف، *Muslim Attitudes*، ص ۲۱۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فلاحی قسم کی تحریک کا آغاز نہیں کیااور نہ ہی یہاں کی عورتوں کے حقوق کی بات کی۔[۲۵]

مرزا ابو طالب خان کی طرح انیسویں صدی کے پہلے نصف میں برطانوی حکومت کی طرف لبرل رویہ رکھنے والے لطف اللہ خان نے [م: ۱۸۵۴][۲۶] ۱۸۴۴ء میں اپنی سرکاری ملازمت کے سلسلے میں لندن کا سفر کیا۔[۲۷] انہوں نے بھی مغرب میں ہونے والی ترقیوں کے ساتھ عورتوں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ان کی رائے مرزا ابو طالب کی رائے سے کسی قدر مختلف اور کسی قدر ملے جلے خیالات پر مبنی ہے۔ اگرچہ انہیں یہ بات متأثر کرتی ہے کہ انگلستان کے مردوں نے اپنی عورتوں کو خوشی سے نقل وحرکت کرنے کی آزادی دی ہوئی ہے، اور جسے وہ بہت سے جھگڑوں سے بچنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں، لیکن وہ اس بات کی تکلیف بھی محسوس کرتے ہیں کہ یہ خوبصورت نوجوان عورتیں کلبوں میں اپنے باپ اور چچاؤں کی عمر کے آدمیوں کے ساتھ نیم برہنہ ناچتی ہیں۔انھیں بے پردہ خواتین بھی پسند نہیں آئیں اور نہ ہی ان کی حد سے بڑھی ہوئی آزادی، جو ان کے نزدیک غیر اخلاقی عادات کا باعث بنتی ہے۔ یہ بہت اہم بات ہے کہ اس دور کے لوگوں نے بری عادات کو غیر مذہبی ہونے کے بجائے غیر اخلاقی قرار دیاہے۔ وہ مسلم خواتین کے نظامِ علیحدگی (seclusion) کو ترجیح دیتے ہیں اور انگریزی نظام کو برا سمجھتے ہیں جس نے خواتین کو لا محدود آزادی دے دی ہے۔ ان کے نزدیک مسلم خواتین علیحدہ رہتے ہوئے اپنے گھریلو کاموں میں مصروف رہتی ہیں جس میں ان کے بھٹکنے کا امکان کم ہوتا ہے۔[۲۸] اس طرح ابو طالب خان نے مغرب کی عورتوں کو ملنے والی آزادی کو وہاں کے مساواتی رویے سے جوڑا ہے اور اسے تحسین آمیز قرار دیاہے تو لطف اللہ خان کو کچھ باتیں اچھی لگیں اور کچھ غیر اخلاقی بھی۔

گویا ابتدائی انیسویں صدی کے مسلمانوں نے یورپ کی ترقی اور خاص طور سے وہاں کی عورتوں کی حالت پر تبصرہ کیا اور ان کو ترقی کرتے ہوئے دیکھ کر انہوں نے جس مسرت کا اظہار کیا وہ بہت اہم ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ انیسویں صدی کے نصف اور آخر کے مسلمانوں نے بھی کم و بیش انھیں باتوں کا مشاہدہ کیا،

۲۵- ایضاً، ص ۲۱۴

۲۶- ایضاً، ص ۲۱۸

۲۷- ایضاً، ص ۲۱۸ ؛ لطف اللہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے حق میں تھے۔وہ انگریزی زبان جانتے تھے اور غالباً وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے انگریزی میں اپنی خودنوشت سوانح لکھی۔

۲۸- مجیب اشرف، *Muslim Attitudes*، ص ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جن کا یہ مسلمان پہلے ذکر کر چکے تھے۔ اس طرح مسلم معاشرے کے افراد ایک طرف جدیدیت کو اپنا رہے تھے تو دوسری طرف جدیدیت، خاص طور سے عورت کی آزادی کے سوال پر،وہ ایک دوسرے سے مختلف رویے کا اظہار بھی کرتے تھے۔

بہرحال، حقوقِ نسواں کے سلسلے میں ہندوستانی جدیدیت پسند مسلم مصلحین اور مفکرین کے خیالات میں یہ اختلاف آگے بھی موجود رہا، جیسا کہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں سرسید احمد خان [م:۱۸۹۸] کے خیالات میں نظر آتا ہے۔ سرسید کی خوبی اوراہمیت یہ تھی کہ انھوں نے نہ صرف جدید مسائل کی طرف توجہ دی بلکہ اس کے حل کے لیے عملی کام بھی کیے۔ اس سلسلے میں ان کی رہنمائی میں ایک اصلاحی تحریک کا جنم لینا اورہم خیال دوستوں کا ایک گروہ بنا کر علی گڑھ میں ایک مکتب قائم کرنا انیسویں صدی کے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔ اس مکتب کے مصلحین اور مفکّرین نے اپنے معاشرے کے اور مسائل کے ساتھ حقوقِ نسواں کی بات بھی کی۔

سرسید احمد خان [م:۱۸۹۸] نے بھی انگلستان کا سفر کیا۔ ان کا یہ سفر سرکاری سفر نہیں تھا جیسا کہ اس سے پہلے لوگوں کا۔ ان کے سفر کا خاص مقصد ولیم میور [م:۱۹۰۵] کی کتاب The Life of Muhammad کا جواب لکھنا تھا۔ اس کے ساتھ انھوں نے دو مقاصد اور جمع کر لیے۔ ایک اپنے بیٹوں کو تعلیم کے لیے وہاں داخلہ دلانا (سید محمود کو حکومتِ برطانیہ کی جانب سے وظیفہ ملا تھا) اور دوسرے وہاں کے تعلیمی اداروں اور طریقہ تعلیم کا جائزہ لینا۔[۲۹]

سرسید کو مغربی تہذیب و تمدن کی ترقی اور عورت و مرد کی مساوات نے اتنا متأثر کیا کہ انھیں وہاں کوئی چیز بری معلوم نہیں ہوئی۔ لیکن یہاں کی عورتوں کی تعلیم کے بارے میں انھوں نے ۱۸۸۴ میں پنجاب کی خواتین سے خطاب کرتے ہوئے جس رائے کا اظہار کیا وہ کافی قدامت پرستانہ ہے کہ

> اے میری بہنوں، میں اپنی قوم کی خواتین کی تعلیم سے بے پرواہ نہیں ہوں۔ میں دل سے ان کی ترقی کا خواہاں ہوں۔ مجھ کو جہاں تک مخالفت ہے اس طریقہ تعلیم سے ہے جس کے اختیار کرنے پر اس زمانے کے کوتاہ اندیش مائل ہیں۔ میں تمہیں یہ نصیحت کرتا ہوں کہ تم اپنا پرانا طریقہ تعلیم

۲۹- سرسید احمد خان ، **مسافرانِ لندن**، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، کراچی، ۱۹۹۶ء، ص ۲۱۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اختیار کرنے کی کوشش کرو وہی تمہارے لیے دین و دنیا میں بھلائی کا پھل
دے گا اور کانٹوں میں پڑنے سے محفوظ رکھے گا۔(۳۰)

ہندوستان کی خواتین کے مقابلے میں وہ انگلستان کی خواتین کے معاملے میں بہت ترقی پسند معلوم ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اپنے سفرنامے میں بارہا ان خواتین کا ذکر اور ان کی تعلیم و تربیت اور تہذیب و شائستگی کا کھلے طور پر اعتراف کرتے ہیں، بلکہ تعریف کرتے ہیں۔ لندن میں جس گھر میں ان کا قیام رہا اس کی مالکہ اور نوکرانیوں تک کی وہ تعریف کرتے ہیں، مسزلڈلم کا سلیقہ، شوہر کی خدمت، امورِ خانہ داری کی تعریف کرتے ہیں۔انھیں ان کی نوکرانی کا اخبار پڑھنا بے حد متأثر کرتا ہے۔(۳۱) ان کے لئے یہ بات بہت اہم تھی کہ متوسط درجے سے کم درجے تک کی عورتوں کی تعلیم بھی کیسے عمدہ طور پر کی جاتی ہے۔(۳۲) گویا سر سید کو مغرب کی عورت جدید تعلیم حاصل کرتی ہوئی بہت اچھی معلوم ہوتی ہے اور وہ اسے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور بار بار اپنے سفرنامے میں اس کا تذکرہ کرتے ہیں۔

وہ لندن میں جب ایک عورت کو رصد خانہ چلاتے ہوئے دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ

۔۔۔شاید اس بات کو سن کر ہمارے زمانے کے علماء اور فلسفی اور منطقی ضرور شرم کریں گے کہ یہ تمام کارخانہ ایک عورت کے سپرد ہے اور جس قدر آلات کہ اب اس میں موجود ہیں اور جو جو عمل اس سے ہو سکتے ہیں وہ عورت کر کے دکھاتی ہے۔ میں دو دفعہ اس میں گیااور اس عورت نے سب کام کر کے دکھایا۔ مجھ کو تو اپنی سفید داڑھی پر اس عورت کے سامنے شرم آئی مگر افسوس ہے کہ ہمارے ہم وطنوں کو شرم بھی نہیں آتی۔۔۔(۳۳)

اس کے برعکس وہ اپنی خواتین کے بارے میں کہتے ہیں: اگر ہندوستان میں کوئی عورت بالکل برہنہ بازار میں پھرنے لگے تو ہمارے ہم وطنوں کو کیسا تعجب اور کس قدر حیرت ہوگی۔ بلا مبالغہ یہ مثال ہے کہ جب

۳۰۔ شیخ عبداللہ، **مشاہدات و تاثرات**، ص ۲۰۱-۲۰۲

۳۱۔ سر سید احمد خان، **مسافرانِ لندن**، ص ۱۹۲-۱۹۳

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۹۳

۳۳۔ ایضاً، ص ۱۸۱-۱۸۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہاں کی عورتیں یہ سنتی ہیں کہ ہندوستان کی عورتیں پڑھنا لکھنا نہیں جانتیں اور حلیے، تربیت اور زیورِ تعلیم سے بالکل برہنہ ہیں تو ان کو ایسا ہی تعجب ہوتا ہے اور کمالِ نفرت اور کمالِ حقارت ان کے خیال میں گذرتی ہے۔(۳۴) برصغیر کی عورتوں کے حوالے سے سرسید کے اس طرح کے خیالات ہمارے لیے اہم ضرور ہیں مگر الجھاؤ کا باعث بھی، کہ وہ اپنی عورتوں کی حالتِ غیر اور مغرب کی عورت کی اچھی حالت کے متعلق اپنی اہم آراء کا ذکر کرتے جاتے ہیں لیکن اپنے معاشرے کی خواتین کی زندگی بہتر بنانے کے لیے جن کوششوں کی توقع سر سید جیسے جدیدیت پسند مصلح اور مفکر سے کی جا سکتی ہے وہ سر سید نہیں کر سکے یا اس سے علیحدہ رہے۔ یہاں ہم یہ سوال اٹھا سکتے ہیں کہ کہیں سرسید بہت زیادہ ہندوستانی سماجی دباؤ کے تحت دو مختلف انداز سے عورتوں کے معاملے پر اپنے خیالات کو پیش کرنے کی کوشش تو نہیں کر رہے تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہم مستقل اس مضمون میں سرسید کی عورتوں کے حوالے سے صحیح جگہ کا تعین بھی نہیں کر پائے ہیں، یہ معاملہ دیگر جدیدیت پسند مفکرین و مصلحین کے ساتھ اس طرح پیش نہیں آیا جیسا کہ سرسید کے ساتھ تھا۔

سرسید کے بیانات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ صرف اس لیے نہیں کہ انھیں ہندوستان کی عورت کا مغرب میں کتنا خیال آیا بلکہ اس لیے بھی کہ جب انھوں نے جدید تعلیم کے حوالے سے ہندوستانی قوم اور خاص طور سے مسلمانوں میں اپنا ایک امتیاز بنا لیا تب بھی وہ عورتوں کے مدرسے جانے اور تعلیم حاصل کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے اور انھیں صرف گھر کی تعلیم تک ہی محدود رکھا۔ شیخ عبداللہ ان کے اس بیان کا حوالہ دیتے ہیں جس میں سرسید نے کہا کہ

> تم غور کرو کہ تمہارے خاندانوں میں مستورات کی تعلیم کا کیا قاعدہ تھا کہ
> ہماری قوم میں، ہماری رشتہ داری میں، ہمارے محلوں میں جو معزز اور با
> وقار گھر ہوتا تھا، جس گھر کی مستورات عمدہ فضیلت، عمدہ اخلاق میں فائق

۳۴۔ ایضاً، ص ۱۹۴؛ محسن الملک نے، ابوالعباس شیخ احمد آفندی کی کتاب **الرحلة الموسومة بالواسطه الیٰ معرفة مالطا وکشف المخبّاعن فنون اوربّا** کے ریویو میں اس مصنف کے حوالے سے مشرقی مرد کا انگلستان کی عورتوں کے سامنے اپنی عورتوں کی جہالت، حقوق سے بے خبری، اور مردوں سے ان کی کشیدگی کی باتیں کرنے کا احوال، ان عورتوں سے اپنی عورتوں کی تعلیم و تربیت اور تہذیب و شائستگی کے لیے مدرسہ بنانے کی باتیں کر کے ان کو متاثر کرنے اور ان حضرات مشرقی کے مغرب کی عورتوں کو بیوقوف بنانے کو بیان کیا ہے۔ **تہذیب الاخلاق**، جلد ۱، ص ۲۹۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

> ہوتی تھیں، اپنی قوم کی۔ ۔۔لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام اس کے سپرد ہوتا تھا۔۔۔شامتِ اعمال سے وہ سلسلہ درہم برہم ہوگیا۔خاندان تباہ ہوگئے۔۔۔وہ مقتدر خواتین جو اس کام کو انجام دیتی تھیں دنیا سے اٹھ گئیں۔۔۔(۳۵)

گویا وہ نانیوں دادیوں کے زمانے کو ہی یاد کرتے رہے، جن کی غیر موجودگی کو وہ خاندانوں کی تعلیمِ نسواں کی تباہی کا باعث سمجھتے ہیں۔

عورتوں کی جدید تعلیم کے بارے میں ان کے خیالات میں تبدیلی نہ آنے کا کیا سبب ہو سکتا ہے؟ ہم ان کی فکر کا تجزیہ اگر دو جملوں میں کریں تو صورت حال یہ تھی کہ جب بھی کسی معاملے میں انھوں نے کوئی موقف اختیار کیا تو اس میں تبدیلی کی گنجائش ہمیشہ کم ہی رہی۔یہی بات عورتوں کے سلسلے میں شاید درست ہو کہ آغاز سے آخر تک وہ اپنے قدیم موقف پر قائم رہے، اور انگلستان میں اس سلسلے میں جو جوش پیدا ہوا وہ ہندوستان کی سر زمین پر قدم رکھتے ہی زائل ہوگیا اور پھر کبھی اس کا خیال دلانے پر بھی نہ آیا۔ سرسید کے عورتوں کی جدید تعلیم سے خوف اور ڈر کے سلسلے میں شیخ عبداللہ کا مشاہدہ یہ تھا کہ سرسید تعلیمِ نسواں کے لیے مدارس قائم کرنے یا کسی جداگانہ انتظام کے مخالف اس لیے تھے کہ وہ سمجھتے تھے کہ کہیں لڑکیاں بھی لڑکوں کی طرح آزاد نہ ہو جائیں۔ اس مخالفت کی دوسری وجہ یہ تھی کہ سرسید پر رسم و رواج کا بہت گہرا اثر تھا جس کی وجہ سے وہ پردے کے بڑے حامی نظر آتے ہیں اور ان کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ تعلیم حاصل کر کے لڑکیاں پردہ چھوڑ دیں گی اور باہر نکل آئیں گی۔(۳۶) شیخ عبداللہ کا یہ بیان سرسید کے بارے میں اس حوالے سے

۳۵- شیخ عبداللہ، **مشاہدات و تاثرات**، ص ۲۰۲

۳۶- ایضاً، ص ۲۰۶ ؛ سرسید کے ایک اور ساتھی نذیر احمد[م: ۱۹۱۷ء] عورتوں کی جدید تعلیم کے سلسلے میں سرسید کے خیالات کی پوری طرح حمایت کرتے ہوئے کہتے ہیں ' میاں کیا تم لڑکیوں کے لیے مدرسہ قائم کرنا چاہتے ہو؟ انگریزی مدارس میں پڑھ کر ہڑدنگیاں (آوارہ) ہو جائیں گی'۔ سرسید کی ہم خیال اور بھی نامور شخصیات تھیں جو عورتوں کے لیے الگ مدرسہ قائم کرنے کے حق میں نہیں تھیں۔ لیکن جب ہم قرونِ وسطیٰ کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہاں مسلم خواتین کی بہت سی مثالیں لڑکیوں کی تعلیم و تربیت ، اسکول ،کالج اور اسپتال قائم کرنے کی ملتی ہیں۔ Waddy, *Women in Muslim History*, p. 87,88,101,
یقیناً اس طرح کی چند مثالیں پورے معاشرے کی عکاسی نہیں کر سکتیں مگر سرسید تو کسی بھی سطح پر عورتوں کو مدرسوں میں تعلیم دلانے کے حق میں نہیں تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حقیقت پسندی پر مبنی معلوم نہیں ہوتا ہے کہ، وہ تو خود رسم و رواج کے مخالف تھے اور ان رسم و رواج سے اپنی قوم کو نکالنے کے لیے ہمیشہ جہاد بالقلم کرتے رہے۔ یہ سماجی معاشرتی دباؤ چونکہ کسی بھی سطح پر آگے بڑھنے کے لیے ایک بڑی رکاوٹ بنا ہوا تھا غالباً اس دباؤ نے انہیں عورتوں کی تعلیم اور پردے کے معاملے میں اور بھی مصلحت اندیشی پر مجبور کیا۔

اس سماجی دباؤ کا اندازہ ہم اس بات سے بھی لگا سکتے ہیں کہ ہندوستان کے حالات میں ۷۰ اور ۸۰ کی دہائی میں جو تبدیلی آئی اس میں اب بڑی عمر کے لوگ مغرب جا رہے ہوں یا نہیں لیکن نوجوانوں کے لیے مغرب جانے کے راستے بہت آسان ہو رہے تھے۔ ہندوستان سے لڑکے تعلیم حاصل کرنے انگلستان جانے لگے تھے۔ ان میں روایت پرست خاندانوں کے نوجوان بھی شامل تھے جو مغربی خواتین سے دل لگا بیٹھنے یا دوسری بدعادات میں گرفتار ہو جانے یا پھر وہیں کے ہو رہنے جیسے افعال کے مرتکب ہوئے، مگر اس مسئلے کے باوجود روایت پرست طبقے نے لڑکوں کو باہر جا کر تعلیم حاصل کرنے سے روکا بھی نہیں! البتہ اس سے جو صورتِ حال پیدا ہوئی اور بعض والدین نے وہاں سے آنے والے نوجوانوں کے رویوں میں جو تبدیلی محسوس کی، اس میں نمایاں اور زیادہ شہرت حاصل کرنے والے اکبرالہ آبادی تھے جو ایسے نوجوانوں پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں:

عشرتی گھر کی محبت کا مزا بھول گئے
کھا کے لندن کی ہوا عہدِ وفا بھول گئے
موم کی پتلیوں پر دل ایسا پگھلا کہ
چمنِ ہند کی پریوں کی ادا بھول گئے

یہ اشعار اس ذہنی عدم مطابقت کی نشاندہی کرتے ہیں جو والدین اور ان کے لڑکوں کے درمیان باہر جانے اور نئی تعلیم حاصل کرنے کے نتیجے میں پیدا ہو گئی تھی۔ تو کیا سرسید نے عورتوں کی جدید تعلیم کے سلسلے میں اپنے ارادوں کو روایت پرست طبقے کی ان باتوں کی وجہ سے چھپائے رکھا؟ سوال یہ ہے کہ کیا عورتوں کے بارے میں ان کی قدامت پرستی کو مذکورہ بالا توجیہ و تجزیے پر ہی چھوڑ دیا جائے اور اس بات پر اکتفا کر لیا جائے کہ باقی معاملات میں ان کا موقف جدیدیت پسندی پر مبنی تھا لیکن جنسِ مخالف کے مسئلے پر وہ اپنے قدامت پسندانہ موقف پر ڈٹے رہے دوسری طرف انہوں نے اسلامی ممالک کی خواتین کی تعلیمی ترقی کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ذکر بھی اپنی کتاب میں کیا ہے کہ ’ روم اور مصر دونوں میں روز بروز تعلیم کی ترقی ہے، عورتیں بھی روز بروز بہت زیادہ پڑھی لکھی ہوتی جاتی ہیں۔ مصر کی ایک مسلمان لڑکی کا میں نے حال سنا کہ سوائے عربی زبان کے جو اس کی اصلی زبان ہے۔۔۔فرنچ زبان بھی نہایت خوب بول لیتی ہے اور لیٹن (لاطینی) اس قدر جانتی ہے کہ جو مضمون یا شعر اس کے سامنے رکھا جائے اس کو پڑھ لیتی ہے اور مضمون سمجھ لیتی ہے۔۔۔‘[۳۷] سرسید کے اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے صرف غیر مسلم عورت کو آگے بڑھتے ہوئے نہیں دیکھا بلکہ دیگر ممالک کی مسلم خواتین کے بہتر حال سے بھی وہ آگاہ تھے اور اسے بتانا بھی چاہتے تھے۔ شاید وہ یہ سمجھتے ہوں کہ جس طرح اس مصری خاتون نے اپنی زبان میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا اور اس کے بھائی کی فرانس میں تربیت ہونے کی وجہ سے اس لڑکی نے اپنے بھائی سے فرنچ اور لاطینی زبانیں سیکھی تھیں،[۳۸] اسی طرح اس ملک کے مرد تعلیم یافتہ ہوکر اپنی خواتین کو جدید تعلیم حاصل کرنے کے مواقع فراہم کریں گے۔ بہرحال، یہ بات تحقیق طلب ہے کہ سرسید کے جدید تعلیمِ نسواں سے ہٹ کر باقی معاملاتِ حقوقِ نسواں میں کیا خیالات تھے، مثال کے طور پر عورتوں کے حقوقِ زوجیت، حقوقِ وراثت کے سلسلے میں۔ یقیناً یہاں ان کے خیالات اسلام کی وسیع المشربی کی عکاسی کرتے ہیں، جس نے عورتوں کو حقوق دیئے ہیں۔

سرسید کے برعکس ان کے رفقاء خاص طور سے نواب محسن الملک، خواجہ الطاف حسین حالی، اور شبلی نعمانی نے جدید تعلیم اور دیگر حقوقِ نسواں کے بارے میں زیادہ جدید خیالات کا اظہار کیا ہے۔ محسن الملک کو مغرب کو قریب سے دیکھنے کا موقع اس وقت ملا جب وہ ایک سرکاری سفر پر انگلستان گئے۔ انگلستان کی مجموعی صورت حال اور ترقی کے بارے میں ان کے خیالات ملے جلے تھے، مگر وہاں کی عورتوں سے وہ بھی متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں ان عورتوں کی خصوصیات ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ

> میں خیال کرتا ہوں کہ انگلینڈ میں دلچسپ چیزیں وہی ہیں جن پر ہم مسلمان بہت کم غور کرتے ہیں۔ یہاں کی سوسائٹی کو دیکھ کر اور جس طریقے سے باہمی اختلاط خانگی زندگی اور قوم کی تعلیم پر اثر ڈالتا ہے وہ

۳۷- سید احمد خان، **مسافرانِ لندن**، ص ۱۹۸-۱۹۹

۳۸- ایضاً، ص ۱۹۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

> میں دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔انگریزی خواتین نہ صرف کتابوں میں مردوں کے برابر تعلیم یافتہ ہیں اور[بلکہ] ہر علم وہ اپنے بچوں کو سکھاتی ہیں، بچوں کی تعلیم اور قوم کی بہبودی پر اس کا اثر قیاس سے باہر ہے۔مگر مسلمانوں میں اس کی بڑی کمی ہے۔(۳۹)

محسن الملک کا یہ بیان اس بات کو واضح کرتا ہے کہ وہ تعلیمِ نسواں بلکہ ان کی جدید تعلیم کو کس قدر اہمیت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر عورتیں تعلیم یافتہ ہو جائیں گی تو وہ نہ صرف اپنے بچوں کی اچھی تربیت کریں گی بلکہ اس کا اثر ملک وقوم کی درستگی پر بھی پڑے گا۔ وہ ایک اور جگہ کہتے ہیں کہ ''میں امید کرتا ہوں کہ عورتوں کی تعلیم ہمیشہ جاری رہے گی۔ کیا وہ گھر درست رہ سکتا ہے جس کی بی بی پڑھی لکھی نہ ہوگی، جبکہ جڑ درست نہ ہوگی تو ہرگز کامیابی کی شکل نہیں'۔(۴۰) شاید محسن الملک کی عورتوں کی جدید تعلیم کے حق میں یہ خواہش اور کوشش تھی جس کی وجہ سے ۱۸۹۶ء میں میرٹھ کے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں عورتوں کی تعلیم کا شعبہ قائم ہوا اور مدرسہ قائم کرنے کی کوششیں کی جانے لگیں۔لیکن یہ حقیقت ہے کہ محسن الملک کو علی گڑھ کالج کا سیکرٹری ہونے کے بعد عورتوں کی تعلیم اور ترقی میں اس طرح سے حصّہ لینے کا موقع میسر نہیں آیا جتنا کہ وہ چاہتے تھے اور جس کے لیے وہ کوششیں کر سکتے تھے۔اس کے باوجود ان کے عہد میں(۱۹۰۳) بمبئ میں ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں جب عورتوں کو چلمن کے پیچھے بیٹھ کر کاروائی دیکھنے کا موقع دیا گیا تو مخالفت کرنے والوں نے یہاں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ مثلاً اخبار **البشیر** کے ایڈیٹر مولانا بشیر الدین نے کانفرنس میں عورتوں کے اس طرح سے شامل ہونے پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا کہ انھوں نے عورتوں کو چلمنوں سے جھانکتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس الزام کے جواب میں شیخ عبداللہ نے شرعی حکم کے مطابق مولانا صاحب کو ملزم یا گناہگار ٹھہراتے ہوئے کہا کہ کسی کو کیا حق ہے کہ وہ اپنی آنکھیں اوپر ہی لگائے رکھے اور یہ کہ شرعی حکم یہ بھی تو ہے کہ اگر عورت سامنے آجائے تو اپنی آنکھیں نیچی کرلو، بجائے اس کے مولانا صاحب چلمنوں میں جھانکتے رہے۔انہوں نے کہا کہ وہ بھی جلسے میں موجود تھے مگر ٹکٹکی باندھے چلمنوں

۳۹- امین زبیری، **حیاتِ محسن الملک**، کراچی، ۱۹۹۶ء، ص ۳۷

۴۰- محسن الملک، **مجموعہ لیکچرز و اسپیچز**)ص۳۷۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے عورتوں کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کررہے تھے۔[۴۱] گویا علی گڑھ کے مصلحین میں مخالفین کے ساتھ حقوق و تعلیمِ نسواں کی حمایت کرنے والے موافقین بھی موجود تھے۔

ان تمام ناقدانہ رویوں کے باوجود ۱۹۰۴ کے سال میں تحریکِ نسواں کے لیے تین اہم کام ہوئے۔ ایک یہ کہ ماہنامہ رسالہ خاتون علی گڑھ سے عورتوں کے حقوق و مساوات کی حمایت میں نکالا گیا جو عورتوں کی تعلیم کی تشہیر کرتا، پردہ ختم کرنے پر زور دیتا اور عام طور سے اس کا مقصد عورتوں کے مسائل کو اٹھانا تھا۔[۴۲] دوسرے یہ کہ بھوپال کی نواب سلطان جہاں بیگم [م:۱۹۰۱] نے تعلیمِ نسواں کے لیے مدرسہ قائم کرنے کی تائید کرتے ہوئے ۱۰۰ روپے ماہانہ کا وظیفہ باندھا۔ تیسرے یہ کہ اس لکھنؤ کانفرنس کے موقع پر تعلیم نسواں کا ایک جلسہ ہوا جس میں لڑکیوں کا مدرسہ قائم کرنے کا ریزولیوشن پاس ہوا، جو آگے بڑھنے کی ایک امید تھا۔[۴۳] اس طرح عورتوں کی جدید تعلیم کو آگے بڑھانے والوں کے لیے مواقع فراہم کرنے میں محسن الملک کی کوششوں کا بڑا نمایاں حصّہ نظر آتا ہے۔ محسن الملک کی طرح عورتوں کی تعلیم اور ان کے حقوق کے لیے علی گڑھ اسکول سے، حالی نے نہ صرف آواز اٹھائی بلکہ اس کے لیے انہوں نے اپنی شاعری سے بھی بہت کام لیا۔ وہ کہتے ہیں:

۴۱- شیخ عبداللہ، **مشاہدات و تاثرات**، ص۱۴۳؛ شیخ عبداللہ کا اشارہ **قرآن** کی اس آیت کی طرف تھا، جس میں ایمان رکھنے والی عورتوں اور مردوں کو مخاطب کیا گیا ہے کہ ایمان رکھنے والوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی آنکھوں کو نیچا کر لیں یا جھکا لیں، اور ایمان رکھنے والی عورتوں سے کہو کہ وہ اپنی آنکھیں جھکا لیں۔۔۔اور اپنی آرائش و زیبائش کو ظاہر نہ کریں؛ اور وہ اپنے پردے اپنے سینوں پر گرا لیں۔ قرآن، سورہ النور ۲۴، آیت ۳۰-۳۱ ؛ شاہیدہ لطیف کا کہنا ہے کہ قرآن کی اس آیت کو عورتوں کے پردے یا ان کی علحدگی پر محمول کیا جاتا ہے اور اس میں ان سے شرم و حیا کی تاکید کی گئی ہے، مفسّرین نے اس آیت کی تشریح میں یہ بھی کہا ہے کہ اس سے خلافِ شرع، یا ناجائز تعلقات سے روکنا ہے، یہ نہیں کہ عورتوں کو گھروں سے نکلنے کی ممانعت ہو۔ طبری نے اس مسئلے پر اپنی تفسیر میں بحث کی ہے کہ کیا عورتوں کو مکمل پردے میں ہونا چاہیئے یا صرف معقول لباس پہننا چاہیئے؟ مکہ میں حج کی رسومات کے دوران، عورتوں کے منہ اور ہاتھ مستقل کھلے ہوتے ہیں جو پردے کی علامت کو ظاہر کرتا ہے۔ قرآن میں پردے کے ارادے کو اس حکم سے بھی دیکھا جاسکتا ہے، جس میں شادی سے پہلے (مرد و عورت) جوڑوں کو ان کی مرضی لینے کی اجازت دی گئی ہے۔ پردے سے متعلق دونوں احکام میں عورتوں کو اپنی زندگیوں کا فیصلہ کرنے اور اس پر کنٹرول رکھنے کی اجازت دی گئی ہے۔ *Muslim Women in India*, p.77

۴۲- عبداللہ شیخ، **مشاہدات و تاثرات**، ص۲۱۴، ۲۲۱، ۲۲۳؛ Lateef, *Muslim Women in India*, p.81,8

۴۳- عبداللہ شیخ، **مشاہدات و تاثرات**، ص۲۲۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہت تم پر ہوئے جور و جفا
حق تلفیاں تم نے سہیں بے مہریاں جھیلیں سدا
جو علم مردوں کے لیے سمجھا گیا آبِ حیات
ٹھہرا تمہارے حق میں وہ زہرِ ہلاہل سر بسر
دنیا کے دانا اور حکیم اس خوف سے لرزاں تھے سب
تم پر مبادا علم کی پڑ جائے پرچھائیں کہیں
ایسا نہ ہو مرد اور عورت میں رہے باقی نہ فرق
تعلیم پا کر آدمی بننا تمہیں زیبا نہیں

حالی کے یہ اشعار اس بات کے غماز ہیں کہ اس وقت لوگوں کے ذہنوں میں صرف یہ بات تھی کہ کہیں لڑکیاں جدید تعلیم حاصل کر کے باہر نہ نکل آئیں۔ حالی نے عورتوں کی تعلیم کے لیے چند عملی کام بھی کئے مثلاً انھوں نے۱۸۹۴ میں پانی پت میں اپنے گھر کے ساتھ ایک مکان میں لڑکیوں کا اسکول کھولا جو چوتھی جماعت تک تھا۔ انہوں نے عورتوں کی تعلیم اور بچوں کی پرورش اور تربیت کے اصولوں پر ایک کتاب مجالس النساء کے عنوان سے لکھی جو پنجاب کی لڑکیوں کے نصاب میں شامل رہی۔وہ بیوہ عورتوں کے عقدِ ثانی نہ کرنے کی رسم کے خلاف بھی آواز بلند کرتے رہے، ان کی نظم ''مناجاتِ بیوہ' 'اس کی ایک مثال ہے۔[۴۴]

علی گڑھ اسکول ہی میں محسن الملک اور حالی کی طرح، بلکہ ان سے کچھ زیادہ، شبلی نے عورتوں کی جدید تعلیم اور حقوق کی بات کی۔ انہوں نے محسن الملک سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مسلمانوں کی توجہ اس طرف دلائی کہ' فرض کیجیے کہ عورتوں کو تعلیم دلانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن آپ مردوں کی تعلیم کے لیے ہی عورتوں کو تعلیم دلائیں۔ کیونکہ بچے کی تعلیم اس کے وجود میں آنے کے وقت ہی سے شروع ہو جانی چاہیئے اور یہ بغیر عورتوں کے تعلیم یافتہ ہونے کے ممکن نہیں''۔[۴۵] گویا شبلی بھی محسن الملک کی طرح سمجھتے

۴۴- صالحہ عابد حسین، **یادگارِ حالی**، ص۱۱۵-۱۱۸؛ ۱۸۹۱ تک حالات یہ تھے کہ بیواؤں کا عقدِ ثانی ایک سماجی برائی تھا اور بجائے ان کے عقد کے ان کی زندگی کی آسانی کے لیے یہ کیا گیا کہ ان کو کوئی روزگار فراہم کیا جائے۔ *Lateef, Muslim Women in India*, p.79

۴۵- نعمانی، شبلی، **اسلام اور عورت**، **باقیاتِ شبلی**، لاہور، ت ن، ص۱۲۳،۱۲۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں کہ ایک ترقی یافتہ قوم بننے کے لیے جڑیعنی گھر کا مضبوط ہونا ضروری ہے۔شبلی جو بہت زیادہ عورتوں کی جدید تعلیم کے حق میں تھے، جو سرے سے عورتوں کے الگ نصاب کے مخالف تھے اور اسے وہ اصولی غلطی سمجھتے تھے کہ اگر یونہی تفرقہ بڑھتا رہا تو دونوں[عورت اور مرد] دو مختلف نوع ہوجائیں گے۔[۴۶] اس طرح انیسویں صدی کے نصف آخر تک ہندوستان کے مسلم جدیدیت پسند مصلحین کی کوششوں سے تعلیم نسواں کے بارے میں خیالات میں ترقی ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔لیکن جب شبلی، سرسید کے بعد علی گڑھ سے ندوہ چلے گئے تو محسن الملک ان مشکلات سے نمٹنے کے لیے تنہا رہ گئے البتہ شیخ عبداللہ، جو رسالہ خاتون [علی گڑھ ۱۹۰۴] کے ایڈیٹر بھی تھے، اور بیگم عبداللہ دونوں عورتوں کے حقوق کے سلسلے میں علی گڑھ سے اٹھائی گئی تحریک کو سرگرم رکھنے میں محسن الملک کے ساتھ رہے۔

شیخ عبداللہ نے اس رسالے کو نکالنے کا سب سے پہلا مقصد یہ بتایا ہے کہ مردوں کی حالت پر توجہ دینے کے ساتھ عورتوں کی حالت پرتوجہ دینے کی بھی ضرورت ہے اس کو وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں اوراس فرض کوادا کرنے کے لیے انہوں نے ایک رسالہ ’’خاتون‘‘ کے نام سے نکالا۔ یہ ایک ماہوار رسالہ تھا جس میں صرف عورتوں کے متعلق مضامین شائع ہوتے تھے۔[۴۷] اس رسالے کے جاری ہونے کے بعد اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ بھی ہوئی۔ ان اعتراضات کرنے والوں میں مولوی ممتاز علی[م:۱۹۳۵]، ایڈیٹر تہذیبِ نسواں لاہور، بھی شامل تھے۔بہرحال، یہ رسالہ ۱۹۱۴ تک نکلتا رہااور جس نے تعلیمِ نسواں کی ضرورت اور اشاعت کے متعلق اپنی آواز بلند کیے رکھی۔

عورتوں کی جدید تعلیم کے راستے میں کافی مخالفتیں اور مشکلیں تھیں، اور یہ مشکلیں صرف مردوں کی طرف سے ہی نہیں آئیں بلکہ بعض عورتوں نے بھی اس کی مخالفت کی۔مثلاً یہ کہ اب فرنگیوں کے طریقے اختیار کرنے کی تدبیر ہو رہی ہے، لڑکیوں کے مدرسے کھلیں گے اور لڑکیاں کھلے منہ مدرسوں میں جایا کریں گی۔یہ کہا گیا کہ آج تک اسلامی حکومتوں میں لڑکیوں کے لیے مدارس قائم نہیں ہوئے اس لیے ایسے مدارس قائم کرنا اسلامی روایات کے خلاف بھی ہے اور ہماری شرافت کے بھی۔ یا یہ کہ ان مدارس میں اعلیٰ و ادنیٰ تمام خاندانوں کی لڑکیاں پڑھیں گی اور شرفاء کی لڑکیوں کوعوام کی لڑکیوں سے ملنا پڑے گا جو شرفاء کو کسی طور گوارا

۴۶- مہر افروز مراد، **شبلی نعمانی کے سماجی قانونی تصورات، اسلام اور عصرِ جدید**) دہلی، ص ۳۱

۴۷- شیخ عبداللہ، **مشاہدات و تاثرات**، ص ۲۱۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں۔(۴۸) ان مشکلات کے باوجود شیخ عبداللہ اور ان کی بیگم عورتوں کی جدید تعلیم کے لیے ایک مدرسہ قائم کرنے کی کوششوں میں لگے رہے۔ شیخ عبداللہ یہ مدرسہ علی گڑھ کے بجائے لاہور میں شاید اسی لیے قائم کرانا چاہتے تھے کہ وہ جانتے تھے کہ علی گڑھ میں اس کے قائم ہونے کے لیے حالات سازگار نہیں ہوں گے۔ لہذا جب انھوں نے مولوی ممتاز علی اور محبوب عالم کو لاہور میں ایک مدرسہ قائم کرنے کے لیے لکھا تو بقول شیخ عبداللہ ' دونوں صاحبوں نے اول تو کچھ جواب نہیں دیا اور جب تقاضا کیا تو دونوں ناراض ہوگئے اور لکھا کہ یہ کام ہمارے بس کا نہیں ہے۔کسی دوسرے مقام پر اگر کوئی صاحب تیار ہوں تو وہاں مدرسہ جاری کرو، لاہور میں نہیں ہوسکتا'۔(۴۹)

علی گڑھ سے باہر مدرسہ قائم کرنے کی کوشش اس لیے بھی کی جارہی تھی کہ عورتوں کی تعلیم کے ساتھ کہیں مردوں کی تعلیم بھی خطرے میں نہ پڑ جائے۔لیکن بیگم عبداللہ کی ہمت سے علی گڑھ ہی میں مدرسہ ۱۹۰۷

۴۸- ایضاً، ص۲۱۳ ؛ سرسید کے ساتھیوں میں نواب وقار الملک پہلے عورتوں کی جدید تعلیم کے حق میں نہیں تھے بلکہ اور کسی معاملے میں اپنے رہنما سے موافقت رکھتے ہوں یا نہیں، عورتوں کی تعلیم کے معاملے میں سرسید کے ہم خیال معلوم ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ''۔۔۔میں ہرگز اس بات کو گوارہ نہیں کرتا کہ عام مدارس میں شرفاء کی لڑکیوں کی تعلیم ہو۔ میری رائے صرف اس قدر ہے کہ بھائی اپنی بہنوں کو ، بیٹے اپنی ماؤں کو، خاوند اپنی بیبیوں کو، باپ اپنی بیٹیوں کو، ۔۔۔پڑھانے کے قابل ہوجائیں گے، اگر ضرورت معلوم ہو تو استانیاں جن کے چال وچلن پر خود گھر والوں کو اطمینان ہو گھروں میں آئیں اور لڑکیوں کو لکھنا، پڑھنا،اور سیناپرونا وغیرہ سکھائیں۔۔۔لیکن جدا مکان میں مدرسہ قائم کرنا اور اس کی نگرانی بیگانہ مردوں کو سپرد کرنا ، یہ دو ایسی بڑی بھاری غلطیاں ہیں جن سے لوگوں کو ہمیشہ کے واسطے ایک دستورالعمل کے طور پر بچنا چاہیے''۔ ندوی،محمد اکرام اللہ خان، **حیاتِ وقار الملک**،کراچی)ص۶۳۲-۶۳۳؛ لیکن بعد کے زمانے میں ان کی رائے میں اتنی تبدیلی پیدا ہوئی کہ علی گڑھ کے مدرسہ تعلیم نسواں کے وہ حامی بن گئے صرف مسلمان شرفا کے آداب اور اسلامی تعلیم و تربیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور اس کے بعد انھوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی میں مسلمان لڑکیوں کے لیے خاص مدارس قائم کرنے کی حمایت کی اور جب بھی انھیں موقع ملا انھوں نے تعلیم نسواں کی ضرورت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ محمد اکرام اللہ خان ندوی،**حیاتِ وقار الملک**، ص۶۳۳؛ ان بیانات کے برعکس ابنِ بطوطہ [م:۱۳۶۹ یا ۱۳۶۸]نے قرونِ وسطٰی کی مسلم خواتین کے پردے، ان کی آزادی، اور ان کی تعلیم کے بارے میں اپنے سفر نامے میں جن مشاہدات کا ذکر کیا ہے وہ بہت دلچسپ اور اہم ہیں۔ Waddy, *Women in Muslim History*, P 110,111,112,118

۴۹- شیخ عبداللہ، **مشاہدات و تاثرات**،ص ۲۱۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں قائم ہوا اور انھوں نے اور ان کی بہنوں نے اسے ترقی دینے میں پوری محنت اور لگن سے کام کیا۔[۵۰] بہرحال، خواتین کی مساوات اور تعلیم کی کوششیں ہو رہی تھیں جن میں خواتین بھی شامل تھیں، مثلاً بھوپال کی سلطان جہاں بیگم ان کوششوں میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصّہ لے رہی تھیں۔ عورتوں کی تعلیم اور صحت میں یہ ان کی خاص دلچسپی تھی جس کے لیے انہوں نے ۱۹۰۳ میں بھوپال میں جو اسکول قائم کیا اس میں ۱۴۰ مسلمان لڑکیاں دس سال تک کی داخل کیں، جہاں ان کو قرآن مع ترجمے کے پڑھایا جاتا۔ اس کے علاوہ اردو، حساب، جغرافیہ، اور گھریلو معاشیات (ڈومیسٹک اکنامکس) کے مضامین بھی پڑھائے جاتے تھے۔ ۱۹۰۷ میں انھوں نے ایک اسکول ہندو لڑکیوں کے اصرار پر ان کے لیے بھی کھولا۔[۵۱] یوں ہندوستان کے مختلف خطّوں میں عورتوں کی آزادی اور تعلیم کے لیے عملی کوششوں کا سلسلہ جاری ہو چکا تھا۔ ۱۹۰۶ء میں ایک وفد تعلیمِ نسواں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ڈپوٹیشن لے کر لیفٹیننٹ گورنر یو پی جیمس لاٹوش [م:۱۹۲۱] کے پاس گیا۔[۵۲] یہ وفد اپنی کوشش میں کامیاب رہا اور اس نے حکومتِ برطانیہ سے تعاون اور امداد کی حمایت حاصل کر لی اور علی گڑھ میں تعلیم نسواں کا آغاز باقاعدہ طور پر ۱۹۰۷ میں ہوا، ایک استانی اور اس کا پورا کنبہ دہلی سے لایا گیا جو صرف لڑکیوں کو قرآن پڑھاتی تھی۔ باقی پڑھنے لکھنے کا کام بیگم عبداللہ اور ان کی بہنیں کرتی تھیں۔[۵۳] ان حالات سے ان مشکلات اور مصائب کا پتہ لگتا ہے جو تعلیمِ نسواں اور حقوقِ نسواں کے سلسلے میں ہندوستان میں ان مردوں کو پیش آئے جو عورتوں کی آزادی کی بات کر رہے تھے۔ اس کا اندازہ ہم عصر دہلی

۵۰- علی گڑھ میں مدرسہ قائم کئے جانے کے سلسلے میں کیرس واڈی کا سرسید کے حوالے سے یہ بیان صحیح معلوم نہیں ہوتا کہ 'سید احمد خود کہتے ہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قومی ثقافت و تہذیب کی ترقی کے لیے عورتوں کی تعلیم ضروری ہے'۔ علی گڑھ میں مشہور یونیورسٹی قائم کرنے کے ساتھ ساتھ، عورتوں کے لیے ایک کالج قائم کیا جس نے ان (عورتوں) کے لیے نئے مواقع مہیا کرنے میں اہم کردار ادا کیا، اور ان کی بیٹی مسز ممتاز جے حیدر تیس سال سے زیادہ عرصے تک اس کالج کی پرنسپل رہیں۔ Waddy, *Women in Mulsim History*, p.159.؛ علی گڑھ میں عورتوں کے لیے اسکول ہی ۱۹۰۰ کے بعد قائم ہوا تھا، اور ہمارے مطالعے کی حد تک سرسید کی ایک بیٹی تھیں جن کا سرسید کے سفرِ انگلستان کے دوران ہندوستان میں انتقال ہوگیا تھا۔ مسز ممتاز حیدر دراصل شیخ عبداللہ اور بیگم عبداللہ کی بیٹی تھیں، کیرس واڈی نے غالباً غلطی سے ان کو سرسید کی بیٹی لکھ دیا ہے۔

۵۱- Waddy, *Women in Muslim History*, p.160,161

۵۲- شیخ عبداللہ، **مشاہدات و تاثرات**، ص ۲۲۶

۵۳- ایضاً، ص ۲۳۲-۲۳۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے نکلنے والے ہفتہ وار اخبار عصمت، جس کے ایڈیٹر علامہ راشد الخیری [م:۱۹۱۲/۱۹۱۳] تھے، کی اس تحریر سے ہوتا ہے:

> مختصر یہ کہ جہاں عصمت نے ان حقوق پر بحث کی جو بیویوں پر تھے۔ وہاں ان حقوق پر بھی زور دیا جو شوہروں کے ذمہ واجب الادا تھے۔۔۔ ایک اور مشکل ہمارے سامنے ہمیشہ رہی اور وہ یہ کہ ہمیں کبھی یہ جرأت نہ ہوئی کہ ہم فرقہ نسواں کے حقوق پر دل کھول کر بحث کرسکیں۔۔۔بہت سی باتیں تھیں جو منہ میں آکر رہ گئیں اور بہت سے خیالات تھے جو دماغ میں چکرا کر رہ گئے۔باتیں کہیں مگر دبی زبان سے، خیال ظاہر کئے مگر ڈرتے ڈرتے۔ (۵۴)

عصمت کا یہ بیان بتاتا ہے کہ عورتوں کے حوالے سے اس وقت ہندوستان کے حالات کیسے تھے۔حقوقِ نسواں کے سلسلے میں علامہ راشد الخیری نے بہت زیادہ کوششیں کیں۔ وہ جب تک زندہ رہے عورتوں کے لیے کام کرتے رہے اور باپوں، بھائیوں، شوہروں اور علماء سے التجا اور درخواست کرتے رہے کہ انھیں بھی اپنی طرح انسان سمجھیں، اچھی زندگی جینے کا حق مردوں کی طرح ان کو بھی خدا اور رسولؐ نے دیا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی تحریر اور تقریر سے عورتوں کی مظلومیت، بے چارگی، اور ستم رسیدگی کی حمایت میں آواز اٹھائی اور مردوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:

> مسلمان اگرعزت کی زندگی گزارنی[نا] اور ترقی کرنی [نا] چاہتے ہیں تو ان کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ عورت کو وہ حقوق واپس کریں جو اسلام نے اسے عطا کئے ہیں اور جنہیں وہ اپنی نفس پروری اور ہٹ دھرمی سے غصب کر چکے ہیں۔ (۵۵)

رسالہ خاتون نکالتے وقت شیخ عبداللہ نے لکھا تھا کہ تعلیم نسواں کی ضرورت مختلف پیرایوں سے ثابت

۵۴- **یادگارِ تمدن**، ص ۷-۸

۵۵- ایضاً، ص ۱-۲ ؛محسن الملک نے ابتدائی مسلم تاریخ میں خواتین کی آزادی کے حوالے دیئے ہیں اور اپنے زمانے میں مردوں کی نالائقی کی وجہ سے عورتوں کو آزادی سے محروم کر دینے کو بھی اجاگر کیا ہے۔**مسلمانوں کی تہذیب، مجموعہ لیکچرز و اسپیچز)** ص ۱۷-۲۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنے کے علاوہ ہماری بڑی کوشش یہ بھی ہوگی کہ

> ہم عورتوں میں اعلیٰ اور پاکیزہ خیالات کی جو ان کی ذات اور ان کی حالت کے مناسب ہوں گے اشاعت کریں،ان میں صحیح مذاق پیدا کریں، ان میں ان نفیس اور اعلیٰ قوتوں کو ترقی دیں جو ان سے مخصوص اور دنیا کے لیے نعمت اور ہماری قومی ترقی کے لیے بڑی ضروری ہیں۔(۵۶)

علامہ راشد الخیری نے حقوقِ نسواں کی حمایت کے لیے تمدن کے نام سے ایک ماہنامہ رسالے کا ۱۹۱۱ میں اجراء کیا۔ رازق الخیری اس رسالے کے بارے میں کہتے ہیں:

> تمدن ہندوستان میں پہلا اور آخری پرچہ تھا جو صرف حقوقِ نسواں کی حمایت میں ۱۹۱۱ء میں جاری کیا گیا تھا۔جس نے چار ساڑھے چار سال تک اسی مقصد کی کامیابی کے لیے ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں۔(۵۷)

ہم مندرجہ بالا بیان کو اس لیے صحیح نہیں سمجھتے کہ اس سے پہلے علی گڑھ کے جدیدیت پسند مصلحین نے ۱۹۰۴ء میں ایک ماہنامے رسالے کا اجرا کر کے خواتین کے حقوق کی بات کرنے کا آغاز کر دیا تھا، لہٰذا تمدن اس سلسلے کی چوتھی کڑی ہو سکتا ہے، اس لیے کہ خاتون سے پہلے لاہور سے ۱۸۹۸ء میں ممتاز علی کا ہفتہ وار رسالہ تہذیبِ نسواں، جسے ان کی بیگم محمدی مرتب کرتی تھیں اور حقوق النّسواں، اسلامی شریعت میں عورتوں کے حقوق کا دفاع کرنے کے لیے وہ خود تصنیف کرتے تھے، نکل رہے تھے۔(۵۸)

ممتاز علی نے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں حقوقِ نسواں کی حمایت میں آواز بلند کی۔ ان کے نزدیک عورت اور مرد میں اگر کوئی تفریق ہے تو صرف حیاتیاتی [Biological] افعال کی ہے۔ وہ عورتوں کی تعلیم کو تاریخی ضرورت قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگرچہ اس کا معیار بہت اچھا نہیں ہے مگر مسلم ہندوستان کے اعلیٰ اور متوسط طبقے اسے قبول کر چکے ہیں البتہ قدامت پرست طبقہ اب بھی اس کا

۵۶- شیخ عبداللہ، **مشاہدات و تاثرات**، ص ۲۱۸

۵۷- **یادگارِ تمدن**، ص ۲

۵۸- Minault, Gail, Women, *Legal Reform and Muslim Identity in South Asia,* Internet, p. 4

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مخالف ہے۔عورتوں کو مردوں کے ساتھ تعلیمی مواقع سے فائدہ اٹھانے کا مساوی حق حاصل ہونا چاہئے۔اگر خدا نے عورت کو آزاد اور مساوی درجہ دیا ہے تو صنف مخالف کے سامنے اپنی حفاظت کرنا اس کی ذمہ داری ہوگی۔ ایک تعلیم یافتہ عورت، غیر تعلیم یافتہ ناتجربہ کار، اور پراگندہ ذہن رکھنے والی کے مقابلے میں، اپنا دفاع اور اپنی حفاظت زیادہ خود اعتمادی اور زیادہ بہتر طریقے سے کرسکتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ عورتوں کے پردے کے بارے میں قرآن نے صرف ایک جگہ ۳۳:۵۳ صاف اشارہ کیا ہے لہٰذا ان کو زبردستی نقاب پہننے پر مجبور کرنا نہ صرف مذہبی قانون کے خلاف بلکہ اخلاقی طور پر بھی نازیبا اور نا انصافی ہے۔ وہ فتاویٰ عالمگیری کا حوالہ دیتے ہیں جو اورنگ زیب کے حکم سے سترہویں صدی کے آخر میں مرتب ہوئے اور جن میں عورتوں کو مردوں کے سامنے اپنے ہاتھ اور چہرے کو کھلا رکھنے کی اجازت دی گئی ہے۔(۵۹) انیسویں صدی کے آخر اور ابتدائی بیسویں صدی کے مسلم مصلحین کے عورتوں کے پردے کے بارے میں خیالات ایک سے ہیں یعنی کوئی بھی چہرے اور ہاتھ کو پردے میں شامل نہیں کرتا۔ ان مصلحین نے حقوقِ نسواں اور تعلیمِ نسواں کے لیے جو کچھ کوششیں کیں وہ محدود نظر آتی ہیں، غالباً اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو مذہب کے دائرے سے کبھی آزاد نہیں کرا سکیں۔لیکن ہم یہاں یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ کم از کم تعلیم کے سلسلے میں ہمارے یہ مصلحین مذہب میں نہیں گئے اور انھوں نے اسے جدید زمانے کا ایک ایسا مسئلہ سمجھا کہ جس کے بغیر آگے بڑھنا ممکن نہیں ہوگا، لہٰذا وہ اس پر آواز اٹھاتے رہے۔

یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ جدیدیت پسندوں کا یہ گروہ اپنی کوششوں میں بہت کامیاب کیوں نہیں ہوا؟جواب واضح ہے، اپنے معاشرے کے بوسیدہ اور فرسودہ روایات میں پھنسے ہونے کی وجہ سے ایسا ممکن نہیں تھا۔ اس کے باوجود یہی لوگ بانی رہنما قرار دیئے جا سکتے ہیں جنھوں نے عورتوں کے حقوق اور مساوات کی بات کو آگے بڑھایا۔اس حوالے سے شاہدہ لطیف کا بیان قابلِ غور ہے جس سے انیسویں اور بیسویں صدیوں کے آخری اور اولین عشروں میں خواتین کی ترقی اوران کے عملی اقدامات کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ تمام ہندوستان میں مسلم خواتین کی نئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ۱۹۰۰ء سے پردہ کلب بننے لگے۔ یہ مسلم خواتین کے ملنے اور اپنے ایک جیسے مسائل پر بحث کرنے کے مواقع فراہم کرتے تھے۔ پہلی مرتبہ عورتیں ایک دوسرے سے قریب لائی گئیں جو بصورتِ دیگر اپنے خاندانوں تک محدود تھیں۔

۵۹- عزیز احمد، **برِ صغیر میں اسلامی جدیدیت**، ص۱۱۴-۱۱۶؛ Minault, *Women, Legal Reform*, p.4

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۹۰۵ میں، ایک مسلم خواتین کانفرنس عطیہ بیگم نے علی گڑھ میں کرائی، ۱۹۰۷ میں لاہور میں بیگم محمد شفیع نے انجمن خواتینِ اسلام بنائی۔[۶۰] ۱۹۱۵ء میں بیگم بھوپال اور دوسری خواتین نے آل انڈیا مسلم خواتین کانفرنس قائم کی، جس کا مقصد مسلمان خواتین میں ایک عام آگاہی پیدا کرنا تھا۔[۶۱] یہ بیانات اس بات کی علامت ہیں کہ جب ایک بار آگے بڑھنے کے عمل کا آغاز ہوجاتا ہے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ اگرچہ جھوٹے یا مصنوعی طور پر ان کو روکنے کی کوشش کی جاتی ہے، مگر اس سے دراصل وہ لاشعوری طور پر اس کی اہمیت کے احساس کی شدت میں اضافے ہی کررہے ہوتے ہیں اس لیے بہتر یہی ہوتا ہے کہ صرف اپنے عہد کے لیے ہی نہیں بلکہ اپنی آنے والی نسلوں کے لیے بھی ہم اجتہاد اور ترقی کے راستے کو، وقت کے تقاضے پورے کرنے کے لیے بڑھنے دیں۔ان تمام مشکلات کے باوجود ان ابتدائی جدیدیت پسندوں کی یہ کامیابی ہے کہ انھوں نے اپنے معاشرتی رسوم و روایات کا مقابلہ کیا اور عورتوں کے حقوق و مساوات کی راہ ہموار کرنے میں اپنے بعد آنے والوں کو مدد دی۔ یہ سب کچھ انہوں نے اپنے محدود وسائل میں رہتے ہوئے کیا۔ان کا معاشرہ سالہا سال سے جن سماجی فرسودہ روایات کو مذہب کا حصّہ سمجھ کر ان پر عمل پیرا تھا تو ایسے ماحول میں چند لوگوں کی یہ کوششیں اس حوالے سے بہت اہم اور سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں کہ اسلام کوئی دقیانوسی مذہب نہیں جس کو مادی زندگی سے ایک طرف کر دیا جائے۔

❁❁❁❁❁

۶۰- Lateef, *Muslim Women in India,*P.81,82

۶۱- Waddy, *Women in Muslim History,* P.161

© rasailojaraid.com